© rasailojaraid.com

مصری عدلیہ کا ایک اہم فیصلہ

جناب خلیل حامدی صاحب

استاذ علی جریشہ مصر کی کونسل آف سٹیٹ کا رُکن تھا - یہ کونسل ایک اعلیٰ عدالتی ادارہ ہے جو سرکاری ملازمین کے خلاف شکایات کی سماعت کرتا ہے اس کے ججوں کو وہی حقوق و مراعات حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے اعلیٰ عدالتی اداروں کو حاصل ہیں - ۲۴ اگست ۱۹۶۵ء کو جمال عبدالناصر کے عہد میں علی جریشہ کو عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ ایک سرکاری غبن کے سلسلے میں تحقیقات پر مامور تھا - اور چونکہ تحقیقاتی کارروائی سے ثابت ہو رہا تھا کہ اس غبن میں حکمران گروہ کے متعدد افراد بھی ملوّث ہیں اس لیے استاذ جریشہ کے عدالتی وقار اور قانونی تحفظ کا لحاظ کیے بغیر ان کو گرفتار کر کے فوجی جیل میں ڈال دیا گیا، جہاں انہیں غیر معمولی اذیت دی گئی - فوجی افسران کو جب یہ معلوم ہوا کہ کونسل آف سٹیٹ کا جج ہونے کی حیثیت سے علی جریشہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ کیا گیا ہے وہ ایک خطرناک اقدام ہے تو انہوں نے علی جریشہ سے زبردستی استعفےٰ دلوایا اور پھر انہیں "فوجی عدالت" میں پیش کر کے بارہ سال قید بامشقت کی سزا دلوائی۔

انور السادات کے دور میں جہاں دوسرے بے گناہ قیدی رہا کیے گئے ہیں اُن میں علی جریشہ بھی ۹ سال کی قید بامشقت بھگتنے کے بعد رہا ہوئے ہیں - ۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء کو علی جریشہ نے قاہرہ کی عدالت میں مصر کے وزیر جنگ کے خلاف یہ مقدمہ دائر کر دیا کہ "اُسے غیر قانونی طور پر گرفتار کیا گیا تھا حالانکہ وہ کونسل آف سٹیٹ کا جج تھا - گرفتاری کے وقت وہ تمام عدالتی تحفظات جو اُسے حاصل تھے پامال کیے گئے - اور باوجود اس بات کے کہ وہ سول آبادی سے تعلق رکھتا تھا اُسے فوجی جیل میں محبوس کیا گیا - اس جیل کے اندر اُسے طرح طرح کا عذاب دیا گیا - اور اذیت رسانی کے خوفناک آلات اس پر استعمال کیے گئے - پھر تعذیب و تشدد کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فضا میں ملٹری پولیس کی طرف سے اس کے خلاف تحقیقات کا آغاز ہوا۔ اور اسی خوف و دہشت کی فضا میں اُسے بتایا گیا کہ چونکہ اُسے انقلابی کونسل کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے لہذا اُسے اپنے منصب سے استعفےٰ دے دینا چاہیے۔ چنانچہ مجبوراً اُس نے حکم کی تعمیل کی اور جبری استعفےٰ دے دیا۔ پھر سپریم سیکورٹی کورٹ آف اسٹیٹ میں اُس پر مقدمہ چلایا گیا جہاں سے اُسے بارہ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ اُس نے جیل میں جو جسمانی اور ذہنی مصائب برداشت کیے ہیں اور گرفتار ہو جانے کے بعد جو مالی نقصانات اُٹھائے ہیں اُن کی تلافی گو اب مادی تخمینوں سے نہیں کی جا سکتی مگر تاہم وہ وزیرِ جنگ اور اُس کے ماتحت کارکنوں سے تیس ہزار پاؤنڈ علاوہ مصارف مقدمہ اور معاوضہ وکیل بطور ہرجانہ کا مطالبہ کرتا ہے" علی جریشہ نے اس درخواست کے ساتھ طبی معائنے کی رپورٹ اور چند تصویریں بھی پیش کیں جو اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ اُسے جسمانی طور پر شدید عذاب دیا گیا ہے۔ اور اُس عذاب کے نشانات جسم کے مختلف حصوں میں صاف نظر آ رہے ہیں۔

۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو عدالت میں مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ اس مقدمے کے دو حصے تھے ایک بنیادی مقدمہ جو مدّعی کی طرف سے موجودہ وزیرِ جنگ کے خلاف دائر کیا گیا تھا۔ اور دوسرا ضمنی مقدمہ جو موجودہ وزیرِ جنگ کی طرف سے سابق وزیرِ جنگ شمس بدران اور اُس کے ماتحت ملازمین جنرل حمزہ بسیونی کمانڈر فوجی جیل کے ورثاء، سعد زغلول ڈائرکٹر ملٹری پولیس کے ورثاء، حسن خلیل ڈائرکٹر ملٹری انٹیلی جنس، میجر حسن کفافی اور لیفٹیننٹ محمد صفوت الروبی کے خلاف دائر کیا گیا۔ سماعت کرنے والا بنچ تین ججوں پر مشتمل تھا۔ ایک خود چیف جسٹس محمود عبدالحافظ ہربدی اور دو جج محمود منصور اور احمد سعد عابد تھے۔ مدّعی کی طرف سے چھ گواہ پیش کیے گئے ذیل میں گواہوں کے بیانات اور عدالت کا فیصلہ درج کیا جاتا ہے:

پہلا گواہ: سابق نائب وزیرِ اعظم "مسٹر کمال رمزی استینو نے شہادت کے دوران بتایا کہ میں ۱۹۶۴ء میں نائب وزیرِ اعظم برائے خوراک اور داخلی تجارت تھا۔ وزارت خوراک کے بعض ملازمین اور سرکاری شعبے کے چند ملازمین کے خلاف غبن کی شکایات موصول ہوئیں۔ چنانچہ میں نے اس وقت کے وزیرِ اعظم علی صبری سے مل کر یہ طے کیا کہ عدالت کے ایک جج کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو ان شکایات کی تحقیقات کرے، اور جس ملازم کے بارے میں غبن کا الزام درست ثابت ہو جائے، یا اس کی کوتاہی واضح ہو جائے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کے لیے مناسب سزا تجویز کرے۔ چنانچہ مدّعی (جج علی جریشہ) کا نام اس کمیٹی کی سربراہی کے لیے تجویز کیا گیا اور علی جریشہ نے بالفعل تحقیقات کا آغاز کر دیا۔ ایک روز علی جریشہ نے مجھے بتایا کہ ملٹری پولیس کے کچھ افسران اُس کے پاس آئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اب تک جو تحقیقات ہو چکی ہیں وہ انہیں بتائی جائیں۔ نیز انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ کیا وہ (یعنی علی جریشہ چیئر مین کمیٹی) کمیٹی کے فیصلوں کے اندر کچھ ہیرا پھیری کر سکتے ہیں؟ اس پر انہوں نے تحقیقاتی رپورٹ کے اندراجات سے تو ملٹری پولیس کے افسران کو آگاہ کر دیا، لیکن کمیٹی کی کارروائی کے اندر کچھ ردّ و بدل کرنے سے انکار کر دیا۔ "علی جریشہ کمیٹی" کی رپورٹ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں، اور فوجی حکام اس میں ہر صورت دخل اندازی کرنا چاہتے تھے، اور علی جریشہ پر جائز و ناجائز ہر طریقے سے ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک روز شام کو ملٹری پولیس کے سپاہی یکایک انکوائری کورٹ کے کمرے میں آگھسے۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ توڑ دیا اور جتنا تحقیقاتی ریکارڈ اندر پڑا تھا اُٹھا کر لے گئے۔ اس واقعہ کے تین روز بعد علی جریشہ کی بیوی میرے دفتر میں آئی اور اس نے مجھے بتایا کہ اُس کے خاوند کو گرفتار کر لیا گیا ہے، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ گرفتاری میرے تفویض کردہ کام کی وجہ سے عمل میں آئی ہے، اور چونکہ اُس نے تحقیقات کے اندر ہیرا پھیری کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ نشانۂ عتاب بن گیا ہے۔ چنانچہ میں اسی وقت وزیرِ انصاف سے ملا، اُسے ساری داستان سنائی اور بتایا کہ علی جریشہ کو گرفتار کر لیا گیا ہے حالانکہ وہ عدلیہ کا ایک رُکن ہے۔ وزیرِ انصاف یہ سُن کر کہنے لگا کہ اُسے اس قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اور اس امر پر اُس نے اظہارِ تعجب کیا کہ اُسے بتائے بغیر عدالت کے ایک جج کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وزیر انصاف نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں حقیقتِ حال کی ٹوہ لگائے گا۔ میں دوبارہ وزیرِ انصاف سے ملا۔ وزیرِ انصاف نے بتایا کہ علی جریشہ کی گرفتاری وزارتِ خوراک کے غبن کے مسئلہ پر نہیں ہوئی ہے بلکہ اس لیے اُسے گرفتار کیا گیا ہے کہ اُس کا تعلق الاخوان المسلمون سے ہے۔"

گواہ مسٹر کمال رمزی استینو نے اپنا یہ تاثر بیان کیا کہ مدّعی (یعنی علی جریشہ) پر جو الزام عاید کیا گیا تھا (کہ اُس کا تعلق اخوان سے ہے) یہ قطعاً نامناسب تھا۔ علی جریشہ غیر جانب دار آدمی تھا۔ ملٹری پولیس کے افسران اور مصری انٹیلی جنس نے یہ الزام اپنی طرف سے تراشا تھا۔ اور یہ لوگ درحقیقت علی جریشہ سے اس بات کا انتقام لینا چاہتے تھے کہ غبن کے قضیے کے سلسلے میں جو ہیرا پھیری وہ اُس سے کروانا چاہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے اس کے لیے وہ تیار نہ تھا"۔

ملٹری پولیس نے ایک فروٹ مرچنٹ کو بھی گرفتار کر لیا جس سے علی جریشہ ذاتی ضرورت کی اشیاء مثلاً پھل وغیرہ خریدا کرتا تھا۔ اُسے اسکندریہ میں مصطفیٰ پاشا چھاؤنی میں بند کر دیا گیا۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں نے جمال عبدالناصر کو اس تمام کہانی سے مطلع کیا۔ چنانچہ پھلوں کے تاجر کی رہائی تو عمل میں آ گئی۔ مگر مدعی علی جریشہ کے بارے میں کوئی کارروائی نہ کی گئی اور وہ بدستور جیل میں محبوس رہا۔

گواہ نے بتایا کہ اُن دنوں حکومت کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ لوگوں کو بلاوجہ گرفتار کر لیتی تھی، انہیں فوجی جیل میں بند کر دیا جاتا تھا، نفسیاتی طور پر انہیں اذیت دی جاتی تھی۔ فاقوں سے مارا جاتا تھا۔ قید تنہائی کی سزا دی جاتی تھی۔ اسکندریہ کے مصطفیٰ کامل فوجی کیمپ میں گرفتار شدگان کو ایسی جگہوں سے گزارتے تھے جہاں انسانی ڈھانچے لٹکے ہوتے تھے۔ اور قیدیوں کی چیخیں اور آہیں بلند ہو رہی ہوتی تھیں۔ اور کُتّے بھونک رہے ہوتے تھے۔

دوسرا گواہ: ایک فوجی افسر دوسرے گواہ سید احمد محمد نے گواہی دیتے ہوئے بتایا:

میں نے جیل میں ایک ایسے انسانی مذبحہ کا مشاہدہ کیا تھا جس کے سامنے تمام مذابح جو آج تک قائم کیے گئے ہیں یا آئندہ تاریخ میں قائم کیے جا سکتے ہیں، ہیچ ہیں۔ میں مسلح افواج میں ایک افسر تھا۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو کرنل محی الدین العشماوی میرے پاس آیا۔ یہ ملٹری پولیس کا ایک افسر تھا اور میرا دوست تھا۔ میں نے اِس خیال سے اُس کو خوش آمدید کہا کہ وہ کسی ذاتی ضرورت کے سلسلے میں آیا ہے۔ اُس نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ چنانچہ میں جونہی باہر نکلا وہ مجھے فوراً فوجی جیل کی طرف لے چلا۔ (گواہ نے اصرار کے ساتھ اس جیل کو باسٹیل آف مصر کہا) جیل کے اندر کا منظر کیا تھا۔ گویا کوئی جنگی میدان تھا۔ زمین پر انسانی لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے جو خون کے اندر لت پت تھیں۔ چلتے ہوئے راستے میں بعض لاشوں پر میرے پاؤں بھی پڑتے تھے۔ ہر طرف چیخ پکار تھی، آہ و زاری تھی اور کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں تھیں۔ مجھے جیل کے آپریشن روم میں لے گئے۔ اس روم کے دروازے چاروں طرف سے کھلے تھے اور اندر انسان اُلٹے لٹکے ہوئے تھے۔ جیسے قصاب جانور کو ذبح کرنے کے بعد لٹکا دیتا ہے۔ ہر انسان پر چار جلّاد مسلط تھے جو کوڑوں کے ساتھ اُس کی خبر لے رہے تھے۔ عذاب کا نشانہ بننے والے لوگ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی دہائی دیتے تھے۔ مارتے مارتے جب کوڑوں کی دھجیاں اُڑ جاتیں تو جلّاد نئے کوڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لے آتے۔ مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں انسانی لاشوں کا مُثلہ کیا جاتا تھا۔ میں اگلے روز شام تک اسی کمرے میں رہا اور انسانیت کے المیہ کا مشاہدہ کرتا رہا۔ دوسرے روز مجھے ملٹری پولیس کے ڈائرکٹر سعد زغلول اور ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائرکٹر حسن خلیل اور حسن کفافی کے سامنے حاضر ہونے کے لیے طلب کیا گیا۔ ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ مدعی (علی جریشہ) کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ وہ میرا ہمسایہ ہے اور اس وجہ سے میرا اُس کے ساتھ دوستانہ تعلق ہے۔ لیکن اُس کے اُوپر جو الزام لگایا گیا ہے اس سے میں بے خبر ہوں۔ وہ کہنے لگے: کیا علی جریشہ نے تم سے ایک مرتبہ یہ سوال نہیں کیا تھا کہ مصر میں فوجی انقلاب برپا کرنے کا امکان کس حد تک ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایسی کوئی گفتگو میرے اور اُس کے درمیان نہیں ہوئی۔ میرے اس جواب پر ملٹری پولیس کے ڈائرکٹر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنی گواہی میں اس گفتگو کا اقرار نہ کیا تو تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کا تم نے اس جیل میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا ہے۔ جب میں نے کہا کہ میں وہی کہوں گا جو حق ہے تو انہوں نے علی جریشہ کو بلوایا اور اُسے کمرے کے اندر لے آئے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پہلی نظر میں مَیں علی جریشہ کو ہرگز نہ پہچان سکا۔ ڈھیلا ڈھالا لباس اُس کے جسم پر تھا۔ پاؤں سے ننگا تھا۔ خون میں لت پت تھا۔ ضربات نے اُس کے چہرے کو بالکل بگاڑ رکھا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے گھور گھور کر اُسے پہچانا۔ میں نے علی جریشہ سے مذکورہ گفتگو کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے صاف انکار کیا کہ ایسی کوئی گفتگو میرے اور اُس کے مابین نہیں ہوئی ہے۔ اس پر ایکا ایک جہنم کے داروغے — گواہ کے الفاظ کے مطابق — علی جریشہ پر ٹوٹ پڑے اور اُسے اس قدر مارا کہ وہ زمین پر دھڑام سے گر گیا۔ اُسے ہاتھوں سے اٹھا کر کھڑا کرتے کیونکہ وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور پھر مارنے لگتے۔ وہ گر جاتا تو پھر اُسے پکڑ کر کھڑا کر دیتے۔ کچھ عرصہ تک یونہی ہوتا رہا۔ وہ مار کھاتا اور گر جاتا۔ یہاں تک کہ اُس نے اقرار کر لیا کہ واقعی اس نے مجھ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مصر میں فوجی انقلاب برپا کرنے کا امکان کس حد تک ہے۔ تازیانوں کی بوچھاڑ میں اُسے ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں لے جایا گیا۔ پھر اُسے دوبارہ فوجی جیل واپس بھیج دیا گیا جہاں وہ مسلسل ایک انتہائی تلخ اور خوفناک عذاب کی بھٹی میں جلتا رہا۔ صبح چار بجے قیدیوں کو کمروں سے نکالا جاتا اور کوڑوں کی زد میں انہیں بیت الخلاء لے جایا جاتا۔ بیت الخلاء میں ایک شخص کو صرف چند سیکنڈ بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس کے بعد انہیں دستوں کی شکل میں شام تک دوڑایا بھگایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا۔ درمیان میں چند منٹوں کا وقفہ ہوتا تھا۔ قیدی جھاڑو کے بجائے اپنے ہاتھوں سے جیل کا صحن صاف کرتے تھے۔ یہ پورا عرصہ علی جریشہ ہمارے ساتھ رہا۔

گواہ نے اقرار کیا کہ مدعی (علی جریشہ) پر یہ مظالم میرے سامنے اور کرنل سعد زغلول اور حسن خلیل اور حسن کفافی کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔ فوج کے سپاہی علی جریشہ کو ہاتھوں سے بھی مارتے تھے اور لاتوں سے بھی۔ علی جریشہ جب مضمحل ہو کر گر جاتا تو اسے کھڑا کر دیتے تھے اور پھر اسے مارنے لگتے تھے۔ اور اسے ایسی فحش گالیاں دیتے تھے کہ زبان انہیں بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تیسرا گواہ: جیل کا ساتھی

تیسرے گواہ ابراہیم منیر کا بیان:

مجھے ملٹری انٹیلی جنس کے احکام کے تحت ۲۵ / اگست ۱۹۶۵ء کو گرفتار کیا گیا۔ اور اسی روز مجھے فوجی جیل پہنچا دیا گیا۔ تین روز تک میں ایک کال کوٹھڑی کے اندر محبوس رہا اور جیل کے کسی ذمہ دار افسر کے سامنے مجھے پیش نہ کیا گیا اور نہ کوئی اور کارروائی کی گئی۔ تیسرے روز آدھی رات کے وقت یکایک تمام کوٹھڑیوں کے دروازے کھول دیے گئے اور محبوسین کو کہا گیا کہ وہ نیچے اتر آئیں اور اپنے کوائف درج کرائیں۔ کوٹھڑی نمبر ۴۹ میری کوٹھڑی سے ملحق کوٹھڑی تھی۔ اس کوٹھڑی کے قیدی (علی جریشہ) نے نیچے اترنے میں دیر لگا دی۔ چنانچہ سپاہی فوراً اس کی طرف لپکے اور اس پر تازیانوں کی تابڑ توڑ بوچھاڑ شروع کر دی۔ یہ زدوکوب کوٹھڑیوں کے نگران افسر صفوت الروبی کے سامنے کی گئی جو قیدی (علی جریشہ) کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک انسان انتہائی مظلومی کی حالت میں گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہے۔ وہ جب فوجی جیل کی کنکریٹ کی بنی ہوئی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا تو بڑی دردناک چیخیں اور آہیں اس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ یہ سیڑھیاں اس قدر دشوار تھیں کہ صحت مند انسان بھی ان پر اترتے چڑھتے مضمحل ہو جاتا تھا۔ قیدی جب اپنا نام یا پتہ بتاتا تو جواب میں فوجی سپاہی اسے ایک تازیانہ رسید کرتا۔ اور مارتے وقت وہ یہ نہ دیکھتا کہ تازیانہ کہاں لگا ہے۔ قیدی کا ادھر ادھر مڑ کر دیکھ لینا بھی تازیانوں کی بارش کو دعوت دے دینا تھا۔ جب تمام قیدیوں کے کوائف لکھ لیے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں واپس چلے جائیں۔ ۴۹ نمبر کوٹھڑی کا قیدی جس انداز سے اترا تھا (یعنی گھٹنوں اور کہنیوں کے بل) اسی دل گداز انداز سے وہ آہ وزاری کرتے ہوئے اوپر چڑھا۔ اور پھر وہ کئی روز تک اپنی کوٹھڑی میں بے بس پڑا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا۔ نہ اُسے کچھ کھانے کو دیا گیا اور نہ پینے کو۔ اور نہ کوئی تفتیشی کارروائی کی گئی۔ چونکہ میری کوٹھڑی اُس سے بالکل ملحق تھی اس لیے میں کوٹھڑی میں بیٹھا اُس کی آوازیں سُنتا رہتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس مظلوم انسان کا نام علی جریشہ ہے۔ دراصل پندرہ روز کے بعد سپاہی سراج نے اُس کی کوٹھڑی کھولی اور مجھے حکم دیا کہ میں یہ کوٹھڑی (نمبر ۴۹) صاف کروں۔ کیونکہ اس کوٹھڑی کا قیدی شدید زخموں کی وجہ سے ہلنے جلنے کی سکت نہیں رکھتا۔ میں سپاہی سراج کی نگرانی میں اس قیدی کے پاخلنے کا برتن صاف کرتا تھا۔ سپاہی سراج ہم دونوں کو آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چند روز بعد میں نے سپاہی سے آنکھ چُرا کر مظلوم قیدی کا نام دریافت کیا۔ اُس نے صرف اتنا کہا کہ میرا نام علی ہے۔ اُس کا مکمل نام مجھے تین چار روز بعد معلوم ہوا۔ جب میں سپاہی کو غافل پاتا تو علی سے کچھ نہ کچھ گفتگو کر لیتا۔"

گواہ نے مزید بتایا کہ:

"مدعی (علی جریشہ) کی کوٹھڑی میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ وہ گو ہلنے جلنے سے بالکل معذور ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے بار بار تحقیقات کے لیے طلب کر لیا جاتا۔ ملٹری انٹیلی جنس کے حکّام اِس قیدی کو شدید عذاب میں مبتلا کر کے دوسرے نظربندوں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرنا چاہتے تھے کیونکہ جب ایک جج کے ساتھ وہ یہ سلوک کر سکتے ہیں تو دوسرے انسان ان کی نظر میں کیا وقعت رکھتے ہیں۔"

میں تین ماہ تک علی جریشہ کی کوٹھڑی کی صفائی پر مامور رہا۔ اُن دنوں گرمی بلا کی پڑ رہی تھی مگر بایں ہمہ مسکین علی جریشہ اور دوسرے قیدی پانی کے چند قطروں کو ترستے تھے۔ کھانا بہت ہی ناکافی ملتا تھا۔ اور زد و کوب کا سلسلہ لامتناہی تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ سپاہی علی جریشہ کو سوٹ پہنا رہے ہیں۔ وہ جب کھڑا ہو کر سوٹ پہن رہا تھا تو زخموں کی شدّت سے وہ لرز رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے خون آلود جوتے دھو رہا ہے اور ساتھ ہی زار زار رو رہا ہے۔

نگران سپاہی کسی کام میں مشغول تھے۔ میں نے موقع پا کر علی جریشہ کو بتایا کہ جیل کے حکّام تمہیں اس لیے لے جا رہے ہیں کہ تم سے ملازمت کا استعفےٰ لکھوا لیں۔ میری بات سُن کر اُسے بڑا اشتیاق ہوا۔ لیکن وہ مجھ سے کہنے لگا کہ جنرل حمزہ بسیونی نے مجھے مستعفی ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ اگر میں نے انکار کر دیا تو آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوب جانتے ہیں کہ میرا کیا انجام ہوگا۔ اتنی سی گفتگو کے بعد میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو تعذیب کا پہاڑ علی جریشہ پر ٹوٹ رہا تھا۔ یہ سلسلۂ تعذیب غیر منقطع تھا۔ "ذہنی غسل" کے لیے جلادوں نے طرح طرح کے طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ ملزمان کو روزانہ دستوں کی شکل میں دوڑایا بھگایا جاتا تھا۔ اور یہ ملزمان تازیانوں اور ہنٹروں اور لاتوں کی ضربات کے تحت دوڑنے کے لیے لپک پڑتے حالانکہ وہ اس قدر شدید اور جان لیوا زخموں سے چور ہوتے تھے کہ اُن کے لیے حرکت کرنا مشکل ہوتا تھا۔"

مدعی علی جریشہ اور کچھ اور ملزم ملٹری کورٹ کے سامنے پیش کیے گئے۔ علی جریشہ ملٹری کورٹ کے سامنے اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ملٹری انٹیلی جنس کی طے کردہ لائن سے اگر کوئی ملزم ذرا برابر بھی ہٹ جاتا تو ملٹری کورٹ کا چیئرمین بریگیڈیر علی جمال الدین عدالت برخاست کر دیتا تھا اور پھر اُسے فوجی جیل میں لے جاتے تھے اور اُسے بالکل ننگا کر کے تازیانوں کی بوچھاڑ کے نیچے برابر دوڑاتے۔ ملٹری کورٹ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے روزانہ زدوکوب کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک ملزم نے جس کا نام منصور عبدالظاہر تھا کورٹ کے سامنے تحقیقات کے نامناسب طریقہ کار کا ذکر کیا تو ملٹری کورٹ کا چیئرمین علی جمال الدین فوراً غضب آلود ہوگیا اور اُس نے کارروائی روک دی۔ چنانچہ اس کے بعد تمام ملزمان کو خوب سبق دیا گیا۔ مادرزاد ننگا کر کے انہیں تازیانے مارے گئے۔ اُن کے سروں پہ چوٹیں لگائی گئیں۔ لاتیں رسید کی گئیں۔ ان کا پانی بالکل بند کر دیا گیا۔ اور لمبے لمبے عرصے تک انہیں دوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ چھاتی کے بل رینگنے کا حکم دیا گیا۔ بھوکا اور پیاسا مارا گیا۔ یہ ستم ایک بار نہیں بارہا توڑا گیا۔ مسلسل توڑا گیا۔"

گواہ نے تسلیم کیا کہ مدعی علی جریشہ ہمیشہ ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہتا تھا۔ اور اس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چل سکتا تھا۔ اُس کے جسم کے اندر قلموں کی نوک چبھونا تو سپاہیوں کا روزانہ کا معمول تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ قلمیں روشنائی سے نہیں خون سے بھری ہوتی ہیں۔ فوجی حکام کی طرف سے علی جریشہ کو سب سے زیادہ عذاب دینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے ملزمان کو ہراساں کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک جج جسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہے جب اُن کے تشدد سے محفوظ نہیں ہے تو کسی دوسرے کی کیا مجال ہے کہ وہ ان کے آہنی ہاتھوں سے بچ نکلے۔

گواہ نے دستہ سسٹم کی ستم رانیوں کا بھی ذکر کیا۔ اس سسٹم کی رُو سے قیدیوں اور ملزموں کے دستوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ دوڑیں اور اُن کے آگے جو فوجی سپاہی انتہائی تیزی کے ساتھ اور دُور فاصلے پر دوڑ رہا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس سے ملیں۔ جو قیدی اُس سپاہی سے پیچھے رہ جاتا کم از کم دس تازیانوں سے اُس کی تواضع کی جاتی۔ آگے دوڑنے والا سپاہی ہر دس منٹ کے بعد تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ مگر مظلوم قیدی پورے آٹھ گھنٹے روزانہ بلا توقف دوڑتے۔ اور جو لڑکھڑا کر گر جاتا عذاب الیم میں مبتلا ہو جاتا۔ جیل کے حکام قیدیوں کو جیل کا صحن ہاتھوں سے صاف کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ صحن اگر صاف بھی ہوتا تب بھی قیدی ہتھیلیوں کے جھاڑو دے رہے ہوتے تھے۔

گواہ نے بیان کیا کہ مدّعی علی جریشہ کو کربناک عذاب دیا گیا۔ اُسے مادر زاد ننگا کر کے اُلٹا لٹکایا جاتا رہا۔ جو لوگ تعذیب کی مہم سرانجام دیتے تھے اُن کے نام یہ ہیں: صفوت الروبی۔ سپاہی سراج۔ رشاد۔ محمد خاطر۔ افسران میں سے احسان العجاتی۔ حسن خلیل۔ شمس بدران۔ حمزہ لبسیونی اور دوسرے لوگ۔ حمزہ لبسیونی مدّعی کو دھمکی دیا کرتا تھا کہ اُسے فنا کر دیا جائے گا۔ نیز حمزہ لبسیونی مدّعی سے برملا کہا کرتا تھا کہ پراسیکیوٹر افسر جو تحقیقات پر مامور ہے مجھے اُس کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ میں اس جیل کے اندر ہمہ مقتدر ہوں۔ میں ہی پراسیکیوٹر افسر ہوں۔ میں ہی جج ہوں۔ میں ہی سرکاری ڈاکٹر ہوں۔ یہ الفاظ دہرا کر وہ مدعی پر ٹوٹ پڑتا تھا تاکہ اپنی بالادستی کا عملی ثبوت پیش کرے۔

(باقی)

© rasailojaraid.com